

ڈاکٹر لیاقت علی
ڈاکٹر عذرا پروین

پاکستانی اردو افسانے میں مولوی کا کردار (پنجابی دیہات کے تناظر میں)

**Maulvi's role in Pakistani Urdu fiction: In the context of
Punjabi villages**

By Dr. Azra Parveen, Lecturer, Department of Urdu, Women
University, Multan.

Dr. Liaqat Ali, Associate Professor, Department of Urdu &
Iqbal Studies, Islamia University, Bahawalpur.

ABSTRACT

The art of characterization is of utmost significance in Urdu Fiction. When Aristotle formed six basic elements of a tragedy, he considered plot and characterization to equal significance. The creation of characters is an integral element of urdu fiction, excluding which cannot create good fictional work. Characters represent their time, locale, and profession. Among miscellaneous characters of Urdu fiction 'the personification of Moulvi' is an important one. This one is not only portrayed in poetry but also occupied a significant place in fictional narratives. Specially in fictional Urdu narratives this character depiction has got twofold appraisal because it is very important in terms of its impact in rural communities. This research article, in perspective of rural Punjab (Pakistan), is presenting varied descriptions of moulvi. In this way it is not only providing social assessing but also life, because fictional narrative is reflection of social life.

Keywords: Punjab, characterization, Moulvi, Culture, Fiction, Exploitation.

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو و اقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور
لیکچرر، شعبہ اردو، خواتین یونیورسٹی، ملتان

مولوی اردو افسانے میں پاکستانی پنجاب کا ایک اہم کردار ہے۔ مولوی کا کردار اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ محض اردو کے افسانوی ادب ہی نہیں بلکہ شعری اور بالخصوص کلاسیکی شعری ادب کا بھی ایک اہم کردار رہا ہے۔ برصغیر کی قدیم ہند مسلم تہذیب میں اس کردار کی ایک اہم حیثیت رہی ہے۔ اردو کی افسانوی نثر کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں اور علامہ راشد الخیری کے افسانوں سے ہوتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ کردار ان ابتدائی افسانوی نثر نگاروں کے یہاں بھی موجود ہے۔ اردو کی شعری روایت میں اس کردار کو زیادہ پسندیدہ کردار کے طور پر نہیں دیکھا گیا اور اپنی شخصیت میں موجود متضاد صفات کی بنیاد پر اسے طنز و مزاح کا نشانہ بھی بنایا جاتا رہا ہے جو اپنی جگہ ایک علاحدہ مطالعے کا متقاضی ہے، لیکن ہمیں فی الوقت اس کردار کے اس تصور کی افسانوی پیش کش کا مطالعہ مقصود ہے جو پاکستانی پنجاب کے دیہی سماج کے تناظر میں تشکیل پاتی ہے۔ مولوی کے کردار کا سماجی مطالعہ بھی کیا جائے تو اس کے حوالے سے بالعموم دو طرح کے تصورات سامنے آتے ہیں۔

پہلا تصور ایک ایسے کردار کی نشان دہی کرتا ہے جو اپنی تمام تر معاشی تنگ دستی اور سماجی و مذہبی جکڑ بند یوں کے باوجود اپنے تئیں اچھی یا بری دینی تعلیم کی ترسیل کر رہا ہے۔ لوگوں کو بنیادی مذہبی اعتقادات کا شعور فراہم کر رہا ہے اور مذہب کی ایسی تشریحات بھی بیان کر رہا ہے جو انہیں خود سری یا بے اعتدالی سے بعض رکھتی ہیں۔ (اگرچہ اس عمل میں مذہبی سے زیادہ سماجی اور مقتدر طاقتوں کی منشا کا عمل دخل اور مفاد وابستہ ہے) دیہات کی مسجد میں پانچ وقت اذان دینا اور نماز کی صورت لوگوں کی سماجی زندگی میں میل جول اور ایک دوسرے کے دکھ درد کو سننے یا بانٹنے کا موقع فراہم کرنا اور لوگوں کی سماجی زندگی کے اُن پہلوؤں میں معاونت کرنا جو مذہبی اعتقادات سے متعلق ہیں، اس کردار کی ذمہ داری قرار پاتے ہیں۔ تاہم ان تمام اہم ذمہ داریوں کے باوجود اسے وہ سماجی توقیر اور معاشی خوش حالی دستیاب نہیں جس کا کوئی بھی فرد متنی ہو سکتا ہے۔

مولوی کے اسی کردار کا دوسرا تصور وہ ہے جو برصغیر میں بالعموم ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ترتیب پانے والے اس شعور کا نتیجہ ہے جو نظامِ معیشت کی بے اعتدالیوں اور مقتدر طبقے کی استحصالی ہتھکنڈوں میں مذہب کو بھی ایک ایسے ذریعے کا درجہ دیتا ہے جس کی بدولت اس استحصال کو زیادہ آسان اور خود استحصالی طبقے کے لئے تقدیر کے نام پر قابل قبول بنایا جاسکتا ہے۔ مولوی کا یہ کردار (مولوی ابوالبرکات کی استثنائی تمثال کو چھوڑ کر) بیشتر جاگیردارانہ سماج کی جکڑ بندیوں اور سازشوں کا ایک حصہ اور اسے مذہبی قبولیت کا رنگ دے کر لوگوں کو قناعت کے نام پر حق کے شعور سے محرومی کا درس دیتا نظر آتا ہے۔ یوں یہ کردار مقتدر قوتوں (جاگیرداروں) کا آلہ کار بنتا ہے۔ دیہات کی نیم خواندہ آبادی کو مزاحمت کی بجائے مفاہمت اور عزت نفس کے احساس کی بجائے تابع

فرمانی کا درس دیتا ہے۔ دوسری جانب یہ کردار حقیقی سماجی مسائل اور طبقاتی تفاوت سے توجہ ہٹا کر لوگوں کو مذہبی اعتقادات کی ایسی تشریح پیش کرتا ہے جو اُن میں صلح جوئی، محبت اور امن عامہ کی ترویج کی بجائے شدت پسندی، نفرت اور فتنہ و فساد پر اُکساتی ہے۔

اُردو افسانہ بالعموم مولوی کے انہی دو تصورات کو پیش کرتا نظر آتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا یہ اختصاص ہے کہ اُردو افسانے میں دیہی سماج کی پیش کش جس تو اترا اور جس مہارت سے اُن کے یہاں نظر آتی ہے اُردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں نہیں ہے۔ انہوں نے اگرچہ جاگیردار کے کردار کو بنیادی اہمیت دی تاہم مولوی کے کردار بھی اُن کے افسانوں سے تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ پریم چند کو اہل دیہات کے ساتھ اپنی فطری نسبت کے سبب دنیائے ادب میں بے حد اہمیت دی جاتی ہے اور بجا طور پر اُردو افسانے میں پہلی مرتبہ جس فنی چابک دستی اور فکری اُچھ کے ساتھ پریم چند نے دیہات کو موضوع بنایا اُس کی مثال نہیں ملتی مگر قاسمی صاحب کی اہل دیہات سے واضح جڑت اور پختہ شعور کے ساتھ دیہی سماج کی پیش کش پر امتیاز علی تاج ایسے نابغہ روزگار بھی انھیں پریم چند پر اہمیت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں:

دیہاتیوں سے ہمدردی رکھنے کے باوجود پریم چند اکثر افسانوں میں شہری کے نقطہ نظر سے اُن کی زندگی کو دیکھتے ہیں لیکن ندیم نہایت بے تکلفی سے دیہات کو دیہات کے نقطہ نظر سے منکشف کرتا ہے۔^(۱)

ڈاکٹر انوار احمد کے خیال میں:

چوپال کے افسانوں میں بلاشبہ پنجاب کے دیہات اور دیہاتی سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں مگر عام طور پر ہماری ملاقات افسانہ نگار ندیم سے نہیں بلکہ اختر شیرانی کی صحبتوں میں بیٹھنے والے شاعر ندیم سے ہوتی ہے۔ ان افسانوں میں موجود نیم پختہ جذبہ، فعالیت اور تفصیل پسندی اُن کے فنی وقار اور رُتبے کو نقصان پہنچاتے ہیں۔^(۲)

ڈاکٹر انوار احمد کی اس رائے میں جس خاص پہلو کی طرف نشان دہی کرتے ہوئے قاسمی صاحب کے فنی وقار کے مجروح ہونے کا اشارہ کیا گیا ہے وہ اُن کی رومانوی تحریر اور جزئیات نگاری ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے بہت حد تک درست بھی ہے تاہم اس نیم پختہ جذبوں اور مثالیت پسندی کے باوجود اُن کا فکری پہلو اور دیہی معاشرت کی حقیقی عکاسی کا سلیقہ اپنی جگہ موجود ہے۔ خود قاسمی صاحب کو اپنے مشاہدات و تجربات کے بعد اخذ کئے جانے والے نتائج پر حقیقی اعتماد ہے کہ انھوں نے ٹھوکر نہیں کھائی:

بلاشبہ زندگی کے ہر شعبے کی ترجمانی کا فرض ادیبوں پر عائد ہوا ہے لیکن ان فرائض کی تقسیم کیوں نہ کر لی جائے۔ شہری شہروں کے متعلق لکھیں اور دیہاتی دیہات کے متعلق! ایک پنجابی اگر پنجاب میں رہتے ہوئے یو۔ پی، بہار، بنگال یا دکن کے باشندوں کی زندگیوں کا جائزہ لینے لگے اور اگر ایک سرحد کے پٹھانوں کے متعلق لکھنے بیٹھ جائے تو مقصد نیک ہے لیکن کامیابی موہوم! (۳)

اگرچہ قاسمی صاحب کی اس رائے سے کئی اتفاق نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ کوئی بھی تخلیقی تجربہ محض ذاتی تجربے کی کوکھ سے جنم نہیں لیتا۔ ذاتی تجربات یا براہ راست مشاہدات بہت حد تک تخلیق کار کے سماجی شعور کو پروان چڑھانے اور واقعات کو قرین قیاس رہنے میں مدد تو دیتے ہیں لیکن بہر حال کسی تخلیق کار کو پابند نہیں کیا جاسکتا کہ وہ جس علاقے کا مکین ہے محض وہیں کی کہانی لکھے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ اہم اور قابل توجہ ضرور ہے کہ قاسمی صاحب کا یہ نقطہ نظر عملی طور پر ان کے تخلیقی تجربات میں واضح طور پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔ پریم چند کی جس سماجی حقیقت نگاری اور اہل دیہات کی پیشکش کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے قاسمی صاحب اس کی نسبتاً زیادہ مؤثر اور بہتر صورت قرار دیے جاسکتے ہیں جیسا کہ اس سے پہلے ہم امتیاز علی تاج کے ایک اقتباس میں بھی اس موازنے میں قاسمی صاحب کی اہمیت کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انور سدید کی اس رائے کا تجزیہ بھی ضروری ہے جہاں وہ یہ موازنہ کچھ اس انداز میں کرتے دکھائی دیتے ہیں:

پریم چند کے دیہات میں سادگی ہے۔ ندیم کے دیہات میں تخلیقی مبالغے کا پرتو ہے۔ پریم چند کے فعال کردار محنت کش ہیں اور تقدیر کو بدلنے کے لئے قوت کو مثبت انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ ندیم کے کردار سستے طریقوں سے دولت حاصل کرنے کے طریقے سوچتے ہیں اور ہاتھ پاؤں ہونے کی قوت عمل میں کم لاتے ہیں۔ پریم چند کے کردار اپنی خصوصیات سے قاری کے داخل کو ہلا ڈالتے ہیں اور اسے اپنا ہمنوا بنا لیتے ہیں۔ ندیم کے کردار روتے ہیں، بلبلا تے ہیں اور رحم کے جذبے کو خارجی وسیلے سے بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پریم چند کے ہاں کفایت لفظی ہے۔ ندیم کے ہاں غیر ضروری طوالت اور پھیلاؤ ہے۔ مجموعی طور پر پریم چند کے افسانے تاثر پیدا کرتے ہیں اور ان کی سادگی میں بھی پُرکاری نظر آتی ہے مگر ندیم کے افسانے رقت پیدا کرتے ہیں اور ان کی آرائش

میں تصنع نظر آتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب شاعر احمد ندیم قاسمی، افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی پر غالب آجاتا ہے اور یہ اکثر ہوتا ہے تو اُن کے کردار زمین کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور خوابناک آرزوؤں میں کھوجاتے ہیں۔^(۴)

انور سدید کی اس رائے کا ان کے قاسمی صاحب سے تعلقات کے تناظر میں بھی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ لیکن فی الوقت موضوع اس کا متحمل نہیں ہے اس لیے ہم قاسمی صاحب کے ہاں مولوی کے کردار کی پیش کش کا جائزہ لیتے ہیں۔ مولوی کے کردار میں مولوی اہل کا کردار تو اُردو افسانے ہی نہیں مجموعی روایت میں چند نامور کرداروں میں سے ایک کردار ہے جس پر آگے چل کر بات کریں گے لیکن فی الوقت اُن کے افسانے ”نیم داد بچے“ میں مولوی کے کردار سے وابستہ اُن کے تصور کو دیکھنے کی سعی کرتے ہیں۔ زیر مطالعہ افسانہ ایک ایسے پڑھے لکھے وکیل کی کہانی ہے جو دیہات سے متعلق ایک مثالی تصور رکھتا ہے۔ اُس نے دیہات اور اہل دیہات کو تجربے کی آنکھ سے دیکھنے کی بجائے اُن رومانوی مصنفین اور شعرا کی آنکھ سے دیکھا اور محسوس کیا ہے جنہیں وہ پسند کرتا ہے۔ ان مصنفین کے یہاں دیہات خوب صورتی، سادگی اور فطرت کے حقیقی پرتو کا استعارہ ہے۔ اپنے اسی حسین تصور کے ساتھ یہ کردار خود ایک انجان دیہات کا رُخ کرتا ہے اور وہاں پگھٹ پر حسین مسکراہٹ بکھیرتی دوشیزاؤں، سادہ لوح کسانوں اور فطرت کے دل فریب مناظر کی توقع رکھتا ہے لیکن پھر اُسے احساس ہوتا ہے کہ اشیا کے مثالی تصور اور حقیقی اشکال میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ یوں بالآخر تنگ ہو کر وہ واپسی کی راہ لیتا ہے۔ افسانے میں اُسے جن کرداروں سے واسطہ پڑتا ہے انھی میں وہ مولوی صاحب بھی ہیں جو امام مسجد ہیں۔ پہلے پہلے وہ مسجد میں قیام کے لئے انھی مولوی صاحب کو درخواست کرتا ہے جسے وہ بری طرح رد کر دیتے ہیں لیکن پھر وکیل صاحب کی سماجی حیثیت اور معاشی آسودگی کا احساس ہوتے ہی مولوی صاحب کا کرخت لہجہ یک لخت شیریں ہو جاتا ہے:

اور پھر جب امام صاحب کو معلوم ہوا کہ محمود کھاتا پیتا نو جوان ہے تو گھر سے اُس کے لئے توشک اور تکیہ لے آئے اور نمازیوں میں مشہور کر دیا کہ یہ گبرو بڑا اللہ والا ہے۔ لکھ پتی ہے پر علم دین حاصل کرنے کے لئے سوکھے ٹکڑے قبول کر لئے۔ تمھارے۔ یقیناً اسلام پھر کروٹ بدل رہا ہے۔^(۵)

مولوی صاحب کے یہ الفاظ مصنف کے اُسی ترقی پسندانہ شعور کے ترجمان ہیں جہاں مولوی کا یہ کردار طبقاتی معاشرے میں جاگیردار کا ایک آلہ کار اور فکرِ معاش سے جڑا ہوا ایسا کردار ہے جو ذاتی مفادات یا مالی منفعت کے لئے سراسر معاشرتی معاملات کو بھی دینی رنگ میں ڈھال کر پیش کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ وکیل صاحب

کی معاشی آسودگی یک لخت اُسے مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اُن کو عزت بھی دے اور اہل دیہات کے لئے قابلِ تکریم بھی بنا دے جس کا سادہ اور آسان حل اس کے نزدیک یہی ہے کہ وہ انھیں ایک دین دار اور نیک فرد کے طور پر متعارف کروائے۔ اس اقتباس کا آخری جملہ کہ ”یقیناً اسلام پھر کروٹ بدل رہا ہے۔“ ایک گہری معنویت کا حامل ہے جو مولوی کے کردار کے تضاد کو بھی عیاں کر رہا ہے اور بظاہر قناعت پسند اور قناعت پسندی کی ترغیب دینے والے اس کردار کے اُس معاشی لالچ کی نشان دہی بھی کر رہا ہے جو ممکن ہے ایک مثالی تصور کے حامل طبقے کے لئے قرین قیاس یا لائق تحسین نہ ہو لیکن خود مصنف جس نقطہ نظر کا حامل ہے وہاں فطری تقاضا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ”الحمد للہ“ دیہی سماج میں مولوی کے کردار کا ظاہری حلیہ ہی نہیں باطنی کش مکش کا بھی عمدہ اظہار ہے۔ اگرچہ افسانے میں مولوی کا تصور ترقی پسندوں کے اس روایتی تصور سے متضاد ہے جس میں یہ کردار جاگیردار کے استحصالی حربوں اور ظلم کو مذہبی تحفظ فراہم کرتا اور لوگوں کے لئے قابل قبول ہی نہیں منشاء ایزدی بنا کر پیش کرتا ہے۔ تاہم افسانے میں ترقی پسندانہ نقطہ نظر اپنی جگہ غالب ہے اور معیشت ایک بڑے جبر کی صورت تمام تر اخلاقی تقاضوں پر حاوی دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ نظامِ معیشت ہی ہے جو معاشرتی ہی نہیں مذہبی و اخلاقی اقدار کا تعین بھی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ افسانہ مولوی کے کردار کے حوالے سے روایتی تشخص کو توڑتا اور اُسے بھی نچلے طبقے کے ایسے فرد کے طور پر ہم سے متعارف کرواتا ہے جسے معاشی جکڑ بند یوں اور شکم سے جڑے معاملات نے اتنا مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے محسن کے مرنے پر محض اس لئے خوش ہو جاتا ہے کہ اُس کی معاشی ضرورتوں کا مقدور بھراز الہ ہو جائے گا اور لطف کی بات یہ بھی ہے کہ یہ معاشی ضرورت بھی محض پیٹ سے جڑی ہوئی نہیں ہے بلکہ اُس سماجی دباؤ کا نتیجہ ہے جو طبقاتی معاشرے میں رکھ رکھاؤ اور رسومات کے نتیجے میں جنم لیتا ہے۔ یوں اس افسانے کا قاری مولوی کے کردار کا منفی تاثر لے کر اُس سے متنفر نہیں ہوتا بلکہ اُس کے لئے شدید ہمدردی کے جذبات پھوٹتے ہوئے محسوس کرنے لگتا ہے۔ ایسے میں مولوی اہل کا اپنے محسن کی موت پر خوش ہونا بھی بعید از قیاس نہیں رہتا اور قاری محض چونکتا نہیں صورت حال کی سفاکی اور عام آدمی کی بے بسی پر افسردہ بھی ہوتا ہے۔ ایسے میں مذہبی عقائد کی ادائیگی یا تعمیل محض انفرادی فعل نہیں رہ جاتا بلکہ ایک پورے نظامِ معیشت کی سفاکی کا بیان بھی بن جاتا ہے:

اگر دُعاؤں کے بدلے میں آسمانوں سے ضروریاتِ زندگی کا اُترنا ممکن ہوتا تو

اُس روز مولوی اہل خدا سے اپنی عمدہ کے لئے جوتے مانگتا۔^(۶)

اسی طرح افسانے میں کثرتِ اولاد کو جس انداز میں مذہبی ذمے داری کے طور پر پیش کیا گیا ہے وہ بھی

مولوی اہل کی تنگ دستی کا ایک بڑا محرک ہے:

مولوی اہل کے یہاں اولاد کا کچھ ایسا تانتا بندھ گیا کہ جب ایک سال اُس کی بیوی کے یہاں کوئی اولاد نہ ہوتی تو وہ سیدھا حکیم صاحب کے ہاں دوڑا گیا..... زیب النساء کے ہاں بچہ نہ ہونا ایسا ہی تھا جیسے پوری رات گزر جانے پر بھی سورج طلوع نہ ہو۔^(۷)

مولوی اہل کا اولاد میں ذرا سی تاخیر پر فکر میں مبتلا ہونا اُسے بتدریج جس معاشی تنگ دستی میں مبتلا کرتا ہے اُس کی صورت اس جملے میں دیکھیے جہاں قاسمی صاحب کا بیدار شعور بول رہا ہے:

اولاد کی افراطِ خدائے ذوالجلال کی رحمتوں میں سے ایک رحمت تھی مگر مشکل یہ آن پڑی کہ ریشمی خوشابی لنگی صافی بن کر رہ گئی۔^(۸)

نمازیوں کی تعداد بڑھنے کی بجائے گھٹ رہی تھی اور ضروریات زندگی کی قیمتیں گھٹنے کی بجائے بڑھ رہی تھیں۔^(۹)

ایسے میں مولوی اہل کی معاشی بد حالی کے عمدہ اشارے افسانے میں موجود ہیں:

بچوں کے پیٹ بڑھ رہے ہیں اور باقی جسم سکڑ رہا تھا۔^(۱۰)

اولاد کی کثرت اور محدود معاشی وسائل مولوی اہل کو ایک ایسا کردار بنا دیتے ہیں جو ایک طرف تو دینی معاملات کو ذمے داری کے ساتھ نبھانے کا خواہاں ہے تو دوسری طرف دنیاوی ضروریات نے اُسے بے بس کر رکھا ہے۔ اُس کی معیشت کا دار و مدار وظیفے کی ملنے والی رقم یا چودھری فتح داد کی مالی معاونت ہے۔ گاؤں کی مسجد میں نمازیوں کا آتے رہنا بھی اُس کے لئے کسی مذہبی سرشاری کا سبب نہیں بنتا بلکہ اسی سے اُس کی معاشی آسودگی وابستہ ہے۔ سو وہ روایتی حربہ استعمال کرتے ہوئے اہل دیہات کو یوں خوفزدہ کرتا بھی نظر آتا ہے:

تمہیں یاد ہوگا کوئٹے میں زلزلہ آیا تھا! کیوں آیا تھا؟ ترکی میں بھونچال آیا کتنے ہی گاؤں کو زمین نکل گئی! کیوں نکل گئی؟ مسلمان ہر جگہ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو رہے ہیں! کیوں ہو رہے ہیں؟ کیوں؟ کبھی سوچا ہے تم نے؟ اور بھلا تم کیوں سوچو، تمہیں تو گندم کے خمار نے دین سے بیگانہ کر رکھا ہے۔ یہ نماز نہ پڑھنے اور علمائے دین کی خدمت نہ کرنے کے نتیجے ہیں۔ یہ تہر الہی ہے۔ یہ آثارِ قیامت ہیں۔ سمجھے؟ اور کیا تم اپنے گاؤں کو بھی زمین کے پیٹ میں اُتار دو گے؟ بتاؤ! بتاؤ!^(۱۱)

یہ ہے وہ معاشی صورتِ حال جس نے مذہبی عقائد کو بھی مخصوص رنگ میں ڈھال دیا ہے اور مولوی اہل جیسے کردار چاہ کر بھی توازن قائم نہیں کر پاتے۔ افسانے میں مولوی کے کردار کا مجموعی تاثر معاشی طور پر ایسے بد حال شخص کا ہے جس کی معیشت کے ذرائع اُسے مجبور رکھتے ہیں کہ وہ مذہب کی بھی من چاہی تاویلات پیش کرتا رہے۔ غلام الثقلین نقوی بھی دیہی معاشرت کی عکاسی کرنے والے اہم افسانہ نگار ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی طرح غلام الثقلین نقوی کے اظہار میں بھی رومانوی اور شاعرانہ عناصر دکھائی دیتے ہیں۔ رومان اور حقیقت کا یہ امتزاج اُن کے نظریہ فن کے اظہار کا نمونہ ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی رائے میں:

غلام الثقلین نقوی کے افسانوں میں تخیل، رومان اور حقیقت کا بڑا دلکش امتزاج ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے پاؤں تو زمین میں گڑھے ہوئے ہیں لیکن نگاہ آسمان کی رفعتوں کو محیط کئے ہوئے ہے اور اس طرح وہ اپنوں میں شریک ہونے کے باوجود اس سے الگ فاصلے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔^(۱۲)

اُن کی کہانی ”یوم الظلّہ“ ایک نیم علامتی کہانی ہے جس کا موضوع بستی کی فضا سے ہوا کا اور بارش کا کوچ کر جانا ہے۔ افسانے کا متکلم ایک حساس شخص ہے جو بستی کو اس عذاب میں گھرا محسوس بھی کر رہا ہے اور اس کے محرکات اور حل جاننے کا خواہاں بھی ہے۔ ”یوم الظلّہ“ یعنی سائبان والا دن، اپنی جگہ اُس تشنگی اور حفاظت کی خواہش کا اظہار ہے جو اس متکلم کو تو محسوس ہو رہی ہے باقی بستی اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں مقید خود کو محفوظ تصور کرتی ہے۔ افسانے کا متکلم یہ بھی محسوس کر رہا ہے کہ فضا میں موجود جس نے گونجتی ہوئی اذان کا گلہ بھی دبا دیا ہے اور پہلے اُسے اس کی آواز کم سنائی دینے لگتی ہے اور آخر تک آتے آتے تو وہ لمحہ بھی آتا ہے جب وہ مسجد میں نماز تو پڑھنے جاتا ہے لیکن یہ سوال بھی اُس کی زبان پر ہوتا ہے کہ آج اذان کیوں نہیں دی گئی۔ اور ایسے میں مولوی صاحب کی اس ذہنی حالت پر ہی شک کرنے لگتے ہیں۔ افسانے میں بڑی مسجد کے ایسے متمول مولوی کا کردار اُبھر کر سامنے آتا ہے جو اس کردار کی روایتی تنگ دستی کے برعکس ایسے چالاک شخص کا تصور پیش کر رہا ہے جو مذہبی آڑ میں پُر تعیش زندگی بسر کر رہا ہے اور لوگوں کو اپنے حق کے شعور سے محروم رکھنے میں بھی سرمایہ دارانہ طبقے کا معاون ہے۔ مسجد کے روحانی تقدس سے قطع نظر اسے ایک ارضی صداقت مانتے ہوئے اس پر جس انداز میں مولوی صاحب قبضہ کرتے ہیں اُس کی جھلک بھی دیکھیے اور مولوی صاحب کا ابتدائی اثاثہ بھی دیکھیے جب وہ یہاں وارد ہوئے:

یہ مسجد اس بستی میں سب سے پہلے تعمیر ہوئی تھی۔ ابھی یہ بلیو پلین سے پوری طرح

اُتر کر زمین پر نہیں آئی تھی کہ بڑے مولوی صاحب نے اس پر قبضہ کر لیا.....
 بڑے مولوی صاحب نے اس جگہ ایک تھڑا سا بنایا، ایک دو صفیں ڈالیں، دو چار
 مٹی کے لوٹے اور ایک مٹکا لا کر رکھا اور اللہ اکبر کہہ دیا۔^(۱۳)
 مولوی صاحب کے اس اثاثے کے بعد متکلم کی زبانی اس اقتباس کو بھی دیکھیے جو ان کی بتدریج تبدیلی کو
 ظاہر کر رہا ہے:

بڑے مولوی صاحب کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ جب وہ اس بستی میں آئے تو
 اُن کے ذاتی اثاثے میں ایک کرتے اور ایک دھوتی کے علاوہ ایک مصلّا اور ایک
 لوٹا بھی تھا۔ یہ مصلّا اور لوٹے کی برکت تھی کہ آج وہ اس بستی میں ایک درمیانے
 درجے کے بنگلے کے مالک تھے اور ایک فیٹ کار اُن کے نیچے تھی۔ شروع شروع
 میں وہ فرش نشیں تھے، پھر حجرہ نشیں بنے اور اب وہ بنگلہ نشیں تھے۔^(۱۴)

افسانے کے ایک اور سرمایہ دار کردار حاجی صاحب کی مل میں اپنی حق تلفیوں کے بیان پر مزدور ہڑتال
 کر دیتے ہیں اور اُن کی ہڑتال بجا ہوتی ہے۔ یہ ہڑتال اور مزاحمتی رویہ اُس بدلتے شعور کا عکاس ہے جو اب نچلے
 طبقے میں پیدا ہو رہا ہے لیکن وہ بھی اس معاملے میں مولوی صاحب سے مدد لیتے ہیں جو انھیں مذہبی حوالوں سے
 صبر و قناعت کا درس دے کر ہڑتال ختم کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ حاجی صاحب اپنے حق کے لئے کی جانے والی
 مزاحمت کو فتنہ و فساد قرار دے کر انھیں کیسے خدا کے عذاب سے ڈرا رہے ہیں، ذرا دیکھیے:

اس دن حاجی صاحب کی مل میں لاٹھیاں اور ڈنڈے برسے، بیسیوں مزدوروں
 کے سر پھوٹے، حاجی صاحب نے مولوی صاحب کی معیت میں ہر زخمی مزدور
 سے ملاقات کی۔ انھیں علاج معالجے کے لئے کچھ رقم عنایت کی۔ مولوی صاحب
 نے کہا: ”دیکھو لوگو! روئے زمین پر فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اللہ فساد یوں کو عذاب
 کی بشارت دیتا ہے۔“^(۱۵)

افسانے میں مجموعی طور پر مولوی کے اس تشخص کو واضح کیا گیا ہے جو مذہب کو ایک ڈھال بنا کر ذاتی
 مفادات اور مقتدر طبقے کے مفادات کی حفاظت کرتا ہے۔

غلام الثقلین نقوی کے افسانے ”شکار“ کا مجموعی موضوع اگرچہ جاگیردارانہ سماج کے اُس جبر کی نشان دہی
 ہے جہاں عام آدمی کو کسی بہانے سے مقدمات میں پھنسانے کے بعد رہائی دلا کر اُسے اپنا آلہ کار بنا لیتے ہیں اور

یوں جرائم کی دنیا میں دھنسنے والے یہ کردار اُن کی منشا کے مطابق جرائم در جرائم کرتے چلے جاتے ہیں لیکن اس افسانے کے خان صاحب کی طرح بعض اوقات مقتدر لوگ انہی کم حیثیت اور تابع فرماں لوگوں کے ہاتھوں مارے بھی جاتے ہیں۔

افسانے میں نچلے طبقے کے اس کردار کی یہ کایا پلٹ مولوی صاحب کے کردار میں موجود بعض صفات کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ مولوی صاحب کو مارنے کا منصوبہ اُسے خان صاحب دیتے ہیں جنہیں یہ رنج ہے کہ الیکشن میں مولوی صاحب نے اُن کے مد مقابل امیدوار کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کیا تھا۔ مرکزی کردار یہ منصوبہ لے کر مولوی صاحب کی مسجد میں رات گئے آتا ہے اور انہیں قتل کرنا چاہتا ہے لیکن پھر دھیرے دھیرے اُن کے رویے اور حسن سلوک سے متاثر ہو کر اپنا ارادہ ترک کر لیتا ہے اور واپس جا کر خان صاحب کو ہی قتل کر دیتا ہے۔

افسانے میں مولوی صاحب کو ایک مثبت کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو گاؤں کی مسجد کو مہمان سرائے کی حیثیت بھی دیتا ہے اور یہاں قیام کرنے والے مسافروں کو کھانا دینا بھی اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ تاہم افسانے میں مرکزی کردار اپنے بچپن کو یاد کرتا ہے اور اپنے گاؤں کے مولوی کے متعلق سوچتا ہے کہ جس سے وہ درس لیتا رہا تو وہاں اُس کے والد کا ایک جملہ اس کردار کے حقیقی تشخص کو عیاں کر دیتا ہے جو اس کردار سے درس تو لیتے ہیں لیکن مولوی بننا پسند نہیں کرتے:

اُسے اپنا بچپن یاد آ گیا جب وہ اپنے گاؤں کے مولوی صاحب سے قرآن پڑھتا اور نماز سیکھتا تھا۔ اُس کے علاقے کے لوگوں میں قرآن حفظ کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس کے دل میں بھی یہی شوق کروٹیں لیتا تھا۔ وہ اُن دنوں سرگھوٹا، اُس پر صافہ لپیٹا اور تہبند کوٹخونوں سے اوپر رکھتا۔ اُس کا باپ کہتا: ”خانو! کہیں مولوی نہ بن جانا!“ وہ جواب میں مسکراتا اور سوچتا میرا باپ نماز کا پابند ہے لیکن وہ مجھے مولوی کیوں نہیں بنانا چاہتا! (۱۶)

یہ وہ عمومی تصور ہے جو اس کردار کے ساتھ ایسا منسوب ہے کہ ہمارے معاشرے کے اجتماعی لاشعور کا حصہ بن گیا ہے۔

دیہی سماج کی اسی پیش کش میں عہد حاضر کے نامور افسانہ نگار منشا یاد کے یہاں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ منشا یاد کے یہاں دیہات ہی نہیں شہر کے بھی بالعموم وہ کردار افسانوں کا موضوع بنتے دکھائی دیتے ہیں جنہیں سماج کی مروجہ اقدار میں خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔ وہ متوسط اور نچلے طبقے کی محرومیوں، خوابوں اور خواہشوں کے

افسانہ نگار ہیں۔ زندگی کے وہ معاملات جو بالعموم ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں یا ہم جنہیں زیادہ اہم نہیں سمجھتے منشا یاد انھی میں سے اپنی کہانیوں کے پلاٹ اور کردار کشید کرتے ہیں۔ اپنے نظریہ فن کو وہ ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

میں جب بھی کوئی ناول پڑھتا ہیرو کی بجائے میری ہمدردیاں ولن کے ساتھ ہوتیں۔ فلم دیکھتا اور ہیروئن اپنی سہیلیوں کے ساتھ کورس گاتی تو میرا ذہن سب سے آخر میں کھڑی اور پوری نظر نہ آنے والی گم نام ایکسٹرا کی حسرتوں کا شمار کرتا۔ میں ریڈیو پر گیت سنتا تو شاعر، گلوکار اور موسیقار سے زیادہ مجھے اُن دیکھے سازندوں کا خیال ستاتا رہتا اور اُن کا بھی جو اُس گیت کی ریکارڈنگ اور ریہرسل میں پہروں مصروف کار رہے مگر جن کے گلے میں سوز اور ہاتھ میں ساز نہیں تھا۔^(۱۷)

یہ ہے منشا کا نظریہ فن جہاں وہ اپنی وابستگیوں ہی نہیں ہمدردیوں میں بھی واضح نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ وہ خود کو نچلے طبقے اور بظاہر نظر انداز کئے ہوئے کرداروں سے جوڑتے اور ان کی کہانی لکھنے پر آمادہ پاتے ہیں۔ منشا یاد کی یہ خواہشیں اور وابستگی ہے جو انھیں عام آدمی کا افسانہ نگار بناتی ہے۔ اُن کا اپنا تعلق شیخوپورہ کے ایک دیہات سے ہے لیکن ملازمت اور روزگار میں انھیں ایک عرصے سے اسلام آباد کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اُن کا عصری شعور دیہی اور شہری سماج کے اس امتزاج سے تشکیل پاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر اسد فیض:

اپنے افسانوں میں منشا یاد نے پنجاب کے دیہات کی ریت روایت، کسانوں اور نچلے طبقے کی کہانی بیان کی ہے۔ وہ ماحول اور ثقافت جو شہروں کی دلکشی کے پس منظر میں گم ہوتا جا رہا ہے منشا یاد نے اُس کی کہانیوں کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے وہ پریم چند کی روایت کا دیہات نگار ہے، البتہ اس کے دیہات پریم چند کے برعکس بیسویں اور اکیسویں صدی کے دیہات ہیں لیکن لگتا ہے کہ مسائل آج بھی وہی ہیں اور نچلی ذاتوں کو خواہ وہ ہندو معاشرہ ہو یا مسلم، دیہات میں ایک جیسے مسائل کا سامنا ہے۔ وہ جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور اُن کی زندگیاں زمیندار کے رحم و کرم پر ہیں۔^(۱۸)

ڈاکٹر اسد فیض کی اس رائے میں ہندو مسلم معاشرے میں اہل دیہات کو ایک جیسے مسائل کا شکار بتایا گیا ہے۔ تاہم ہندوستان نے جاگیردارانہ نظام سے بہت پہلے ہی جان چھڑوالی تھی سو جیسی صورتحال ہمارے یہاں

اہل دیہات کو درپیش ہے ویسی شاید وہاں نہیں ہے۔ تاہم اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ منشا یاد کے ہاں دیہی سماج کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے جس کی طرف ممتاز مفتی یوں اشارہ کرتے ہیں:

منشا یاد وہ واحد افسانہ نویس ہے جو ہمیں اپنے اصلی دیہاتی عوام کے جذبات سے آگاہ کرتا ہے۔ اپنی لوک روایات کی یاد دلاتا ہے جو ہماری شناخت ہیں۔^(۱۹)

ممتاز مفتی کی اس رائے میں بھی ایک جزوی صداقت تو موجود ہے کہ منشا یاد کے ہاں ہمارے دیہاتی عوام کی نمائندگی بخوبی نظر آتی ہے لیکن یہ کہنا قطعی طور پر درست نہیں کہ وہ ایسے واحد افسانہ نگار ہیں۔ ہم احمد ندیم قاسمی یا طاہرہ اقبال جیسی افسانہ نگار بہر حال اس روایت کا اہم ترین جزو ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس ضمن میں نجم الحسن رضوی کی رائے توازن کی حامل ہے جہاں وہ ایسی حتمی رائے سے اجتناب کرتے ہیں:

وہ پاکستان کے شاید واحد افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں میں ہمیں اپنے دیہی معاشرے کی کچی روح کلباتی نظر آتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارے جن دیگر کہانی کاروں نے پنجاب کے دیہی معاشرے کی عکاسی کی ہے اُن کی کہانیوں میں کوئی کمی تھی۔ ہرگز نہیں، چاہے وہ آج کے سب سے بڑے افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی ہوں یا بلونت سنگھ یا غلام الثقلین نقوی ان سب نے اپنے اپنے انداز میں نہایت پُر اثر کہانیاں ہمیں دی ہیں اور بے شمار کردار تخلیق کئے ہیں۔ مگر منشا کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے پنجاب کی دیہی معاشرت کے استعاراتی پہلوؤں پر زور دے کر اپنے افسانے میں نئے معنی پیدا کئے ہیں۔ یعنی گاؤں کے طوطے، فاختائیں، کٹوے اور بٹیر پودے صرف وہی نہیں رہے جو وہ ہیں۔ بلکہ اپنی جون سے باہر آ کر ہمیں کچھ اور جہانوں کی کہانیاں سنانے لگتے ہیں۔^(۲۰)

ممتاز مفتی اور نجم الحسن رضوی کی ان آرا سے ہٹ کر ڈاکٹر انوار احمد کی رائے بھی دیکھیے جہاں وہ منشا کو اپنی وابستگی کے اعتبار سے منٹو یا غلام عباس کی توسیع قرار دے رہے ہیں:

وہ نظر انداز کئے جانے والے معتب لوگوں کو منٹو کی طرح سینے سے لگانا چاہتا ہے۔ غلام عباس کی طرح عام آدمی کی کہانی لکھنے کا خواہاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے افسانوں میں نہ ریشمی پردے سرسراتے ہیں اور نہ یوکلپٹس آہیں بھرتا ہے۔ نہ ڈاگی کو سینے سے بھینچا جاتا ہے اور نہ ہی شاہانہ ڈاننگ ہال میں برتنوں،

تہنہوں کی کھنک اور سرگوشیوں کی مدھم موسیقی سنائی دیتی ہے۔ اس کی تمام تر کہانیوں میں ایک گھر ثابت و سالم ملتا ہے جو شکست و ریخت کے طوفانوں کی زد میں ایک جزیرہ سادکھائی دیتا ہے۔^(۲۱)

منشایاد کی بعض کہانیوں میں بھی مولوی کے کردار کو پیش کیا گیا ہے۔ اُن کا افسانہ ”آدم بُو“ ایسا ہی ایک افسانہ ہے جس کا مرکزی کردار مولوی اللہ رکھا ہے جو افسانے کے آغاز میں ہی اس اضطراب میں مبتلا دکھایا گیا ہے کہ ساتھ والے گاؤں میں نوجوان مولوی منظور فارغ التحصیل ہو کر آیا ہے اور اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور یہ چھوٹا مولوی اُسی باپ کا بیٹا ہے جس کے خلاف کبھی مولوی اللہ رکھا نے فتویٰ دیا کہ اُسے بڑی مسجد سے بے دخل کیا تھا، سواب بدلے کا ایک امکان بھی موجود ہے جو مولوی اللہ رکھا کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں اور خدام کے ذریعے مولوی منظور کے معمولات سے باخبر رہے۔ ایسے میں اُسے اپنا ماضی بھی یاد آتا ہے جب وہ جاگیردار کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر گاؤں سے بھاگ گیا تھا پھر کسی دینی مدرسے سے دین کے اُس تصور کو لے کر پلٹا تھا جو فلاح پر یقین رکھتا ہے اور یوں اُس نے آغاز میں جب مسجد سنبھالی تو نذر و نیاز اور طمع و لالچ سے گریز کرتا رہا۔ لیکن پھر شادی کے بعد بتدریج بڑھتے معاشی مسائل اور بچوں کی وجہ سے وہ بھی ان طبقوں اور معاشی فوائد کو اہمیت دینے لگا اور آہستہ آہستہ ایک متمول آدمی بن گیا۔ لیکن اب اُسے یہ فکر آن گھیرتی ہے کہ نیا مولوی بھی نئے دینی و سماجی علوم لے کر دین کا ایسا تصور متعارف کروا رہا ہے جو اُس کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

انہیں یہ سوچ کر ہول آتا ہے کہ پتا نہیں نوجوان مولوی درس گاہ سے کیا کیا نئی باتیں سیکھ کر اور کس سانچے میں ڈھل کر آ گیا ہو اور اُسے علم کا جو جن چمٹا ہوا ہے وہ کب تک اُسے چمٹا رہے اور اب تو اُس نے اپنے واعظ میں تاریخ، جغرافیہ اور گنتی سائنس کیس باتیں بھی شامل کرنا شروع کر دی ہیں۔^(۲۲)

یہ وہ سائنس اور علم دشمنی ہے جو یہ کردار نیم خواہ معاشرے میں مذہبی تقاضا سمجھ کر پھیلاتا ہے لیکن درحقیقت وہ اس شعور کو اپنے معاشی وسائل کے لئے ایک بڑا خطرہ تصور کرتا ہے، سو مذہب کی غلط تاویلات کے ذریعے عام آدمی کو ان کے خلاف کرنا چاہتا ہے۔

افسانے میں اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے وہ جس جبر کی فضا کی نشان دہی کرتا ہے وہ اپنی جگہ دیہی سماج کی ایک تلخ حقیقت ہے جہاں مولوی کو بھی ایک کمی کین کے طور پر دیکھا اور استعمال کیا جاتا ہے۔ اُس سے بھی اسی

نوع کی خدمت کی توقع رکھی جاتی ہے اور اُس کے ساتھ اُسے تفریح طبع کی خاطر مذہبی مسائل کی بجائے زمیندار لوک کہانیاں بھی سننا چاہتا ہے۔ منشا یاد کے ایک اور افسانے ”خواب در خواب“ میں بھی جاگیردار کا مولوی سے سوہنا وزینی کا قصہ سننے کی فرمائش کا ذکر ملتا ہے اور اس افسانے میں بھی جاگیردار اس خواہش کا اظہار کرتا دکھائی دیتا ہے:

وہ اکثر اُس سے سوہنا وزینی کا قصہ سنتا تھا۔ اُسے دوسرا کوئی قصہ یا کتاب پسند نہیں تھی اور سوہنا وزینی کا قصہ اُس نے اتنی بار سنا تھا کہ اُسے خود زبانی یاد ہو گیا تھا۔ مگر بڑھک ہر دفعہ اتنی دلچسپی سے سنتا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار سُن رہا ہو۔ وہ یہ قصہ سنا کر تنگ آ گیا تھا اور انکار نہ کر سکنے کی اذیت میں مبتلا رہنے لگا تھا۔^(۲۳)

اسی طرح افسانے میں مولوی کے اُس کردار کی جھلک اور تصور بھی موجود ہے جو مولوی اللہ رکھا کے نئے دینی شعور سے پہلے موجود تھا۔ اُس کی صورت بھی دیکھیے جو مولوی کے کردار کی بخوبی وضاحت کر رہی ہے:

اُن سے پہلے گاؤں کے نیم خواندہ امام مسجد نماز پڑھانے، بچے کے کان میں اذان دینے، بھیڑ بکری ذبح کرنے اور جنازہ پڑھانے کا معاوضہ لیتے تھے۔ ہر فصل کے موقع پر دوسرے کمی کاریوں کی طرح بوبل میں اُن کا بھی حصہ ہوتا۔ عید، بقر عید پر وہ مسجد میں کپڑا بچھا دیتے اور عید نماز پڑھانے کے عوض لوگوں سے غلہ اور نقدی وصول کرتے۔ نماز پڑھا کر وہ قربانی کے جانوروں کو ذبح کرتے اور پھر چھوٹی اور بڑی کھالوں کے بیوپار میں اُلجھے رہتے۔ اُن کا حکم تھا کہ انڈہ کھانے کے لیے اس پر بھی تکبیر پڑھنا ضروری ہے کیوں کہ اُس میں بھی جان ہوتی ہے۔ لوگ انھیں تین انڈوں پر تکبیر پڑھانے پر ایک انڈہ بطور معاوضہ دیتے۔^(۲۴)

یہ مولوی کے کردار کا وہ تصور ہے جو مذہبی سماج میں راسخ رہا ہے اور جہاں مذہبی عقائد کی تکمیل بھی دراصل مولوی صاحب کی معاشی ضرورتوں سے جڑی ہوئی ہے۔ پھر معاشی ضرورتوں سے جڑا یہی تصور خود مولوی اللہ رکھا کو بھی دین کے فلاحی تصور سے اس تلخ حقیقت تک لے آتا ہے کہ اب وہ نذر و نیاز سے براہ راست انکار تو نہیں کرتا مگر اتنی احتیاط ضرور کرتا ہے کہ:

میں کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ کسی کے ہاتھ سب چیزیں ہمارے گھر پہنچا دی جائیں۔^(۲۵)

فکرِ معاش مولوی کو اُس کے حقیقی منصب سے کیسے گرا سکتا ہے یا وہ کیسے مذہب کو ایک ذریعے کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔ اس موضوع پر اس سے قبل احمد ندیم قاسمی اور غلام الثقلین نقوی کے یہاں بھی کہانیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

فرخندہ لودھی بنیادی طور پر اُن خواتین لکھنے والوں میں شمار کی جاتی ہیں جو عورت کے احساسات کو مردانہ سماج کی جکڑ بند یوں کے تناظر میں بیان کرتی اور تصویر کا دوسرا رخ دکھانے کی سعی کرتی ہیں۔ اُن کے ایک افسانے ”دوسرا خدا“ کا موضوع اسی نوع کی جنسی گھٹن کا پتا دیتا ہے جہاں مرد کو اس حوالے سے آسودگی دستیاب ہے لیکن عورت گھر کی چار دیواری میں قید کر دی جاتی ہے۔ افسانہ ایک ایسے کنبے کی کہانی ہے جس کے سربراہ مولوی باقر ہیں۔ مولوی باقر کی شخصیت اور نظریات روایتی مذہبی تصور کے حامل ہیں جو عہدِ نو کے تقاضوں اور انسان کی سماجی نفسیاتی ضرورتوں سے بے خبر ہیں۔ وہ اپنے لئے ایک بھرپور جنسی زندگی کا سامان مذہبی ضرورت کے طور پر چار شادیوں کے ذریعے کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن دوسری جانب اُن کے گھر کی تمام خواتین (چار بیویاں اور ایک بیٹی ثریا) ایسی قیدی نظر آتی ہیں جنہیں محض مولوی صاحب کی اطاعت اور خدمت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

مولوی صاحب کی ان بیویوں کا نقشہ مصنفہ کچھ یوں کھینچتی ہیں:

یہ چاروں عورتیں مولوی باقر کی ملکیت تھیں۔ مل کر زندگی بسر کر رہی تھیں۔ ایک دوسرے سے حسد کرنے کی ذہنی اور جسمانی دونوں طور سے ضرورت کہاں؟ گھر داری، بچوں کی پرورش کے ساتھ پانچوں نمازیں اور کلامِ پاک اور باری باری شوہر کی خدمت۔ یہ تھی اُن کی زندگی۔ خدا اور شوہر کی باندیاں بندگی میں خوش تھیں۔^(۲۶)

مندرجہ بالا اقتباس محض صورتِ حال کا بیان نہیں بلکہ بین السطور اس میں مصنفہ کا بطور خاتون احتجاج اور طنز بھی شامل ہے۔ یہ مردانہ سماج جو مذہبی ذمے داری کے نام پر عورت کو مرد کا غلام بنانے کا متمنی ہے اور لطف تو یہ کہ خود عورتیں بھی اس زندگی کو اپنا نصیب ہی نہیں تقاضا سمجھ کر قبول کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ مولوی باقر اسی نوع کا کردار ہے جو مذہب سے متعلق دقیقاً نوی تصور کا حامل ہے۔ وہ اس کے انہیں عناصر کو پیش کرتا ہے جو اُسے ایک مقتدر قوت کے طور پر متعارف کروائیں اور عورتوں کو محض تابع فرمانی کا درس دیں۔ مولوی صاحب کی ناراضی ان بیویوں کے لئے خدا کی ناراضی ایسا عمل ہے:

بیویوں کو بلا کر پوچھ گچھ ہوتی۔ قصور اور بے قصور سب کی ڈانٹ ڈپٹ ہوتی۔ قصور وار کے لئے سزا بس اتنی تھی کہ مولوی صاحب اُس کے پاس جاتے ضرور مگر ہم

کلام ہوئے بغیر لوٹ آتے اور وہ بے چاری یہ خیال کرتی اپنے اطوار درست رکھتی کہ کہیں مولوی صاحب کو زیادہ غصہ نہ آجائے۔ مجازی خدا ناراض ہو تو خدا کا قہر ٹوٹ پڑے گا۔^(۲۷)

دوسری جانب افسانے میں مولوی صاحب کے ایسے تشخص کی نشان دہی بھی کی گئی ہے جو کسی صورت اہل خانہ کو شعور دینے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اُس کے لئے وہ انھیں یہ تاثر بھی دیتا ہے کہ دنیا یا سماجی زندگی گناہوں کی دلدل ہے۔ سو اس سے کنارہ کشی ہی بہترین حکمت عملی ہے:

ماں اور بچوں سبھی میں یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ وہ دنیا کے بہترین لوگ ہیں، اس لئے عام لوگوں سے نہیں ملتے۔ دوسرے سب جاہل، اجڈ، گنوار اور گناہ گار ہیں۔ ان سے مل کر عاقبت غارت ہوگی۔^(۲۸)

سماجی زندگی سے یہ دوری بالآخر مولوی صاحب کے لئے وہ پریشانی سامنے لے آتی ہے جس کا حل بھی انھیں سمجھائی نہیں دیتا۔ بڑی بیٹی ثریا قاسمی صاحب کے افسانے ”سناٹا“ کی کلثوم کی طرح ہسٹریا کی مریض بن جاتی ہے اور اُس کی تشخص یہ کی جاتی ہے کہ اسے جن چٹ گئے ہیں۔ اب یہ جن نکالنے کی جتن شروع ہوتے ہیں۔ ایک نوجوان عامل کے لمس کے احساس سے کسی قدر مرض کا ازالہ ہوتا ہے۔ افسانے کا انجام جنسی گھٹن اور سماجی عمل سے بیگانہ کر دی گئی اولاد کے شدید ترین ردِ عمل کی صورت سامنے آتا ہے۔ نوجوان عامل اسماعیل کو علاج کی خاطر کمرے میں مکمل تخلیہ درکار ہوتا ہے اور مولوی صاحب ایسے وقت میں تذبذب کا شکار نظر آتے ہیں کیوں کہ معاملہ بہر حال جوان بیٹی کا ہوتا ہے۔ ایسے میں اسماعیل خود پلٹ جانا چاہتا ہے لیکن اُس کا یہ فیصلہ ثریا کے اُس شدید ردِ عمل اور جنسی گھٹن کو عیاں کر دیتا ہے جسے مذہبی تاویلات میں دبانے کے جتن کئے جاتے رہے ہیں:

نہیں آپ نہیں جائیں گے۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔ یہاں میرا دم گھٹتا ہے..... یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔ یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔ وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔ عامل کی بانھوں میں سر رکھے تسلسل کے ساتھ کہے جاتی تھی۔ دم گھٹتا ہے۔ میرا دم گھٹتا ہے۔ اور مولوی باقرباب کمرے میں نہیں تھے۔^(۲۹)

افسانہ مجموعی طور پر مولوی کے اُسی کردار کی نشان دہی کر رہا ہے جو مذہب کے نام پر اولاد کو سماجی زندگی سے بیگانہ کر دیتے ہیں اور نتیجتاً اولاد اسی قسم کے نفسیاتی عوارض کا شکار ہو جاتی ہے۔

اُردو کی ایک اور خاتون فکشن نگار الطاف فاطمہ کے ہاں بھی مولوی کا کردار اُن کے افسانے ”چھوٹا مولوی“

میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اگرچہ اس افسانے میں موجود دو مولویوں کے کردار اور درپیش حالات پر احمد ندیم قاسمی کے افسانے ”الحمد للہ“ اور نامور کردار مولوی اہل کے گہرے اثرات دکھائی دیتے ہیں تاہم مجموعی حوالوں سے اس کردار کے کئی دوسرے پہلوؤں کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ افسانے کے آغاز میں ہی افسانہ نگار ہمیں مولوی صاحب کے کردار سے جس انداز میں متعارف کرواتے ہیں اُسی سے اس کردار کے تاثر کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے:

چھوٹا مولوی اس علاقے پر خدا کا قہر بن کر نازل ہوا تھا۔^(۳۰)

اس خدا کے قہر کا سبب دراصل مسجد میں لگنے والا وہ نیا مائیکروفون ہے جسے ضرورت کے وقت ہی نہیں بنا ضرورت بھی مولوی صاحب استعمال کرتے ہیں، جس سے اہل محلہ کے آرام میں خلل پڑتا ہے۔ دراصل یہ صورت حال ہمارے سماج میں اُس مذہبی جبر کی نشان دہی کر رہی ہے جہاں مسجد کے لاؤڈ سپیکروں سے رواداری اور اخوت کی بجائے منافرت پھیلانے کا کام لیا جاتا ہے۔ ایسے میں اہل محلہ یا بیمار لوگوں کی پروا بھی نہیں کی جاتی لیکن مولوی صاحب کو منع کرنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف بن جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ افسانے میں ہمارے سماج میں خرد پسندی اور علمی روایت سے زیادہ جوشِ خطابت کی روایت کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔ اس ضمن میں افسانہ نگار کا موقف کھل کر سامنے آ جاتا ہے اور وہ مولوی کے کردار کو اس انداز میں پیش کرتی ہیں:

جمعے پر جمعے آتے رہے اور ہر گزشتہ جمعے کے مقابلے میں تازہ خطبہ زیادہ سے زیادہ کڑک دار اور ڈپٹی ہوئی آواز میں ہوتا رہا۔^(۳۱)

لیکن اس جوشِ خطابت اور دن رات لاؤڈ سپیکر کے استعمال کے مریضوں پر پڑنے والے اثرات سے جب مولوی صاحب کو آگاہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ فوراً اسے مذہبی معاملہ بنا کر لوگوں کو مشتعل کرنے لگتے ہیں:

اور جب مطلع کیا گیا کہ ورد کے اس اہتمام کے بعد عارضہ قلب کے کئی مریضوں کی ای سی جی کے نتائج حیرت ناک حد تک مایوس کن نظر آئے ہیں تو اُس نے بیماری اور موت کو منجانب اللہ ٹھہرایا اور مرض کی شدت کو آزمائش بتا کر گزشتہ خطبوں سے زیادہ کڑکتا ہوا ناراضگی سے پُر ایک خطبہ ہوا کی لہروں کے حوالے کیا، اور اس سبب میں اشارتاً اس نکتے پر زور دیا کہ یہ سب مفسدوں کی شرارت ہے۔^(۳۲)

یہ وہ عمومی رویہ ہے جو ہمارے سماج میں موجود ہے اور جہاں مذہب کے نام پر لوگوں کو اشتعال دلایا جاتا ہے۔ مذکورہ افسانے میں اپنی اسی گھن گرج کے ساتھ سامنے آنے والا مولوی اُس وقت پریشاں حال دکھائی

دیتا ہے جب اُسے معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ کے علاقے میں بھی مسجد میں لاؤڈ اسپیکر لگ گیا ہے اور وہاں کے مولوی کے پیچھے نماز پڑھنے والوں کی تعداد بتدریج بڑھتی جا رہی ہے۔ مولوی کا دوسرے مولوی سے حسد کا یہ رشتہ اپنی جگہ قابلِ غور ہے۔ افسانے میں نئی مسجد کی تعمیر پر تبصرے بھی ہمارے سماجی ماحول اور مذہب سے جڑے کرداروں کے مجموعی رویوں کو واضح کرتے نظر آتے ہیں۔ انہی رویوں میں سے ایک مسجد کی تعمیر کے نام پر لیا جانے والا وہ چندہ بھی ہے جو سال ہا سال لیا جاتا ہے لیکن مسجدیں نامکمل ہی رہتی ہیں۔ اسی نوع کے ایک کردار کا نئی مسجد کی تعمیر پر یہ تبصرہ دیکھیے جو بظاہر سادہ مگر گہری معنویت کا حامل ہے:

بس دیکھ لی ہیں ایسی محبتیں بنتی، دیکھ لینا عین درمیان میں آ کر رقم گھٹ جائے
گی، پھر گھر گھر چندے مانگتے پھریں گے تعمیر مسجد کے۔^(۳۳)

افسانے میں مولوی کے کردار کی کئی پرتوں کو واضح کیا گیا ہے جس میں سب سے غالب پہلو فکرِ معاش ہے۔ اس افسانے کا چھوٹا مولوی بھی قاسمی صاحب کے مولوی اُبل کی طرح معاشی تنگ دستی اور کثرتِ اولاد کا شکار ہے۔ اُس کا زوال بھی اُسی روز سے شروع ہوتا ہے جب وہ خانگی ذمے داریوں میں جکڑا جاتا ہے۔ چھوٹے مولوی کا ذریعہ معاش خیرات، بخشش، شادی و مرگ کی رسومات یا ٹیوشن سے ملنے والی رقم ہے:

اس خبر کے آگے بڑھتے ہی چھپر والی مسجد میں مقتدر دکان داروں کے مشورے سے طے پایا کہ وہ خود چندہ کر کے ایک رقم مولوی صاحب کو دیا کریں گے اور وہ محلے کے بچوں کو مفت قرآن پڑھائیں گے..... اور چھوٹا مولوی اب تک ٹیوشن کی تلاش میں مصروف تھا۔ اُس کے ہر سن و قد و قامت کے بچوں سے کوارٹر کا اکلوتا اور بڑا کمرہ بھرا رہتا تھا بجز اُس وقت کے کہ اُن میں سے آدھے درجن کے قریب سکولوں کو چلے جاتے تھے۔^(۳۴)

یہ وہ صورتِ حال ہے جو مولوی اُبل اور چھوٹے مولوی دونوں کو درپیش ہے۔ وہاں مولوی اُبل کی لنگی صافی میں بدلی تھی یہاں چھوٹے مولوی کی صورتِ حال بھی کچھ مختلف نہیں:

چھوٹے مولوی کے اُبلے اور گھٹنوں سے بہت نیچے ڈھیلے ڈھالے کرتے اور پگڑی میں کلف استری کی بجائے پیلا اور ملگجا پن نمایاں ہونے لگا تھا۔ پھر ایک دن اس گرتے کی پشت پر ایک مربع فٹ کے لگ بھگ ایک پیوند نمودار ہوا۔^(۳۵)

اور افسانے کے آخر میں مولوی اُبل کی طرح معاشی ضرورتوں سے مجبور چھوٹا مولوی جب دوسرے مولوی

سے بیوی کی زچگی کے وقت قرض مانگتا ہے تو نہ صرف اُس کی تنگ دستی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ اس کردار سے متعلق موجود نقطہ نظر کی توسیع خود اُسی کی زبانی ہو جاتی ہے:

اپنی حاجت اہل محلہ کے سامنے لے جاتے یوں ہچکچاتا ہوں کہ مولوی تو ہوتے ہی بدنام ہیں۔ مفت خور اور خیرات، زکوٰۃ پر گزارنے والے۔^(۳۶)

یہ وہ راسخ تصور ہے جو اس کردار کے ساتھ مشروط ہے۔ الطاف فاطمہ کے ہاں بھی صورتِ حال کچھ مختلف نہیں ہے

گزشتہ دو دہائیوں میں جدید اُردو افسانے کو جن نئے لکھنے والوں نے متاثر کیا اُن میں اسلام آباد میں مقیم نامور افسانہ نگار حمید شاہد بھی شامل ہیں۔ حمید شاہد کی کہانیاں موضوعات اور تکنیک کے متنوع تجربات کی حامل ہیں۔ افسانے کے ایک جدید ناقد اور عالمی ادب کے گہرے مطالعے کی بدولت حمید شاہد کے افسانوں میں گہرا سماجی شعور بھی نظر آتا ہے اور بین الاقوامی مسائل کی نشان دہی بھی ملتی ہے۔ اُن کے بیشتر افسانوی کردار شہری زندگی سے متعلق ہیں۔

حمید شاہد کی ایک کہانی ”ملبہ سانس لیتا ہے“ میں مولوی نما معلّم کے کردار کو دیکھا جاسکتا ہے۔ افسانہ نگار اگرچہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ۸/ اکتوبر ۲۰۰۷ء کو شمالی علاقہ جات اور اسلام آباد میں آنے والے زلزلے کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ تاہم ماسٹر فضل کا کردار ہمارے سماج میں موجود مولوی کے تشخص کی نشان دہی کر رہا ہے۔

ماسٹر فضل پیشے کے اعتبار سے پرائمری سکول کے معلّم ہیں لیکن اپنی وضع قطع اور معاملات کے اعتبار سے مولوی کی ذمہ داریاں بھی نبھاتے نظر آتے ہیں۔ اس کا ایک سبب ماسٹر فضل کے باپ کا مسجد پیش امام ہونا بھی ہے۔ ماسٹر فضل دورانِ زچگی اپنی بیوی کی موت پر غم زدہ اور اُس کی یادوں کو قیمتی اثاثے کے طور پر ساتھ رکھنے والا ایک کردار ہے جو مولوی کے روایتی پُر تشدد، غضب ناک یا محبت سے نفرت کرنے والے کردار کے برعکس نرم دل اور محبت کے جذبے سے سرشار کردار نظر آتا ہے جسے ”الحمد للہ“ کے مولوی اہل کے برعکس اگر دینی فرائض میں غفلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو یہ غفلت فکرِ معاش سے جنم لینے والی ذہنی پریشانی کا نتیجہ نہیں بلکہ جوانی میں مر جانے والی بیوی کا دکھ ہے۔ بیوی کی موت کے بہت عرصے بعد تک بھی ماسٹر فضل کے ہاں اُس کی موجودگی اور لمس کا احساس باقی رہتا ہے جو انھیں ڈھنگ سے عبادت بھی نہیں کرنے دیتا:

بعض روز تو یوں ہوتا تھا کہ وہ اپنے تئیں رات بھر تلاوت کرتے رہتے تھے مگر جو

ورق اُلٹ پلٹ کر دیکھتے تو خود کو کوسنے اور شیطان مردود کو پھٹکارنا شروع کر دیتے کہ آخر تلاوت کرتے کرتے وہ کہاں چلے جاتے ہیں۔^(۳۷)

رات تراویح سے لوٹے تو یہی کوئی گھنٹہ پون گھنٹہ ہی کمر سیدھی کر پاتے ہوں گے کہ انھیں لگا کہ جیسے کوئی روئی جیسے ملائم ہاتھوں سے اُن کے پاؤں کے تلوے سہلا رہا ہو۔^(۳۸)

افسانے میں ماسٹر فضل کی یہ کیفیت کئی مواقع پر دیکھی جاسکتی ہے جہاں بیوی کی محبت اُس کے مذہبی فریضوں پر حاوی ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ مجموعی طور پر افسانے میں ماسٹر فضل اور اُن کے والد کی صورت میں مولوی کے نسبتاً روایتی تصور سے انحراف دکھائی دیتا ہے۔

یہ مولوی کے کردار کا وہ مجموعی جائزہ ہے جو اُردو افسانے میں اس کردار کو خدو خال اور تصورات کو پیش کر رہا ہے۔ تاہم بعض اور افسانوں میں بھی مولوی کا یہ کردار دکھائی دیتا ہے جن میں غلام الثقلین نقوی کا ’سید نگر کا چودھری‘ (بندگی)، مسعود مفتی کا ’محب شیشہ‘ (محب شیشہ)، ممتاز مفتی کا ’مورا‘ (ان کہی) بھی شامل کیے جاسکتے ہیں۔

حواشی

- ۱۔ امتیاز علی تاج، ”دیباچہ“، ”چوپال“، احمد ندیم قاسمی، (لاہور: اساطیر، ۱۹۹۵ء)، ص ۲۲
- ۲۔ ڈاکٹر انوار احمد، ”اُردو افسانہ ایک صدی کا قصہ“، (فیصل آباد: پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)، ص ۷۲
- ۳۔ احمد ندیم قاسمی، ”دیباچہ“، ”طلوع وغروب“، (لاہور: اساطیر، ۱۹۹۵ء)، ص ۹
- ۴۔ ڈاکٹر انور سدید، ”اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش“، (لاہور: ابلاغ پبلشرز، ۲۰۰۵ء)، ص ۵۷، طبع دوم
- ۵۔ احمد ندیم قاسمی، ”سیلاب و گرداب“، (لاہور: اساطیر، ۱۹۹۵ء)، ص ۵۸
- ۶۔ احمد ندیم قاسمی، ”سناٹا“، (لاہور: اساطیر، ۱۹۹۶ء)، ص ۱۲۱
- ۷۔ ایضاً، ص ۱۲۰
- ۸۔ ایضاً، ص ۱۲۰
- ۹۔ ایضاً، ص ۱۲۱
- ۱۰۔ ایضاً، ص ۱۲۳
- ۱۱۔ ایضاً، ص ۱۳۸
- ۱۲۔ ڈاکٹر انور سدید، ”فکر و خیال“، (سرگودھا: مکتبہ اُردو زبان، سنہ ندارد)، ص ۱۰۲

- ۱۳۔ غلام الثقلین نقوی، ”غلام الثقلین نقوی کے بچپن منتخب افسانے“، مرتبہ سجاد نقوی، (لاہور: کاغذی پیرہن، ۲۰۰۶ء)، ص ۲۵۵
- ۱۴۔ ایضاً، ص ۲۵۸
- ۱۵۔ ایضاً، ص ۲۶۲
- ۱۶۔ ایضاً، ص ۳۴۲
- ۱۷۔ محمد منشا یاد، ”کہانی اور میں“ (پیش لفظ)، مشمولہ ”خلا اندر خلا“، (راول پنڈی: مطبوعات حرمت، ۱۹۸۳ء)، ص ۱۰، طبع اول
- ۱۸۔ ڈاکٹر اسد فیض، ”دیباچہ“، مشمولہ ماہ نامہ ”سپونک“ (منشایاد: ایک مطالعہ)، لاہور، جولائی ۲۰۰۸ء، ص ۳
- ۱۹۔ ممتاز مفتی، ”معزز“، ایضاً، ص ۲۵
- ۲۰۔ نجم الحسن رضوی، ”منشایاد..... درخت آدمی“، ایضاً، ص ۶۰
- ۲۱۔ ڈاکٹر انوار احمد، ”خلا اندر خلا“، ایضاً، ص ۵۱، ۵۰
- ۲۲۔ محمد منشا یاد، ”کہانی اور میں“ (پیش لفظ)، مجلہ بالا، ص ۷۳
- ۲۳۔ ایضاً، ص ۷۴
- ۲۴۔ ایضاً، ص ۷۶
- ۲۵۔ ایضاً، ص ۷۷
- ۲۶۔ فرخندہ لودھی، ”آر سی“، (لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۳۱
- ۲۷۔ ایضاً، ص ۱۳۲
- ۲۸۔ ایضاً
- ۲۹۔ ایضاً، ص ۱۳۳
- ۳۰۔ الطاف فاطمہ، ”وہ جسے چاہا گیا“، (کراچی: شہزاد، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۵۶
- ۳۱۔ ایضاً، ص ۱۵۷
- ۳۲۔ ایضاً، ص ۱۵۸
- ۳۳۔ ایضاً، ص ۱۶۰
- ۳۴۔ ایضاً، ص ۱۶۵
- ۳۵۔ ایضاً، ص ۱۶۶، ۱۶۵
- ۳۶۔ ایضاً، ص ۱۶۷
- ۳۷۔ محمد حمید شاہد، ”محمد حمید شاہد کے پچاس افسانے“، مرتبہ ڈاکٹر توصیف تبسم، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۹۱
- ۳۸۔ ایضاً، ص ۱۹۱

ماخذ

- ۱۔ احمد، انوار، ڈاکٹر، ”اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ“، فیصل آباد: پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء
- ۲۔ تاج، امتیاز علی، ”دیباچہ“، ”چوپال“، احمد ندیم قاسمی، لاہور: اساطیر، ۱۹۹۵ء

- ۳۔ سدید، انور، ڈاکٹر، ”اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش“، لاہور: اہلاغ پبلشرز، ۲۰۰۵ء، طبع دوم
- ۴۔ _____، ”فکر و خیال“، (سرگودھا: مکتبہ اردو زبان، سندھ ندارد)، ص ۱۰۲
- ۵۔ شاہد، محمد حمید، ”محمد حمید شاہد کے پچاس افسانے“، مرتبہ ڈاکٹر توصیف تبسم، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء
- ۶۔ فاطمہ، الطاف، ”وہ جسے چاہا گیا“، کراچی: شہزاد، ۲۰۰۴ء
- ۷۔ قاسمی، احمد ندیم، ”دیباچہ“، ”طلوع وغروب“، لاہور: اساطیر، ۱۹۹۵ء
- ۸۔ _____، ”سیلاب و گرداب“، _____، ۱۹۹۵ء
- ۹۔ _____، ”سناٹا“، _____، ۱۹۹۶ء
- ۱۰۔ لودھی، فرخندہ، ”آرسی“، لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۱۹۹۱ء
- ۱۱۔ نقوی، غلام الثقلین، ”غلام الثقلین نقوی کے پچیس منتخب افسانے“، مرتبہ سجاد نقوی، لاہور: کاغذی پیرہن، ۲۰۰۶ء
- ۱۲۔ یاد، محمد منشا، پیش لفظ بہ عنوان ”کہانی اور میں“، مشمولہ ”خلا اندر خلا“، راول پنڈی: مطبوعات حرمت، ۱۹۸۳ء، طبع اول

رسائل و جرائد

- ۱۔ ماہ نامہ ”سپونٹک“ (منشایاد: ایک مطالعہ)، لاہور، جولائی ۲۰۰۸ء

